Fatima Sahar
Ph.D Scholar, The Women
University Multan

Dr. Azra Parveen
Head of Department,The Women
University Multan.

فاطمہ سحر
پی ایچ ڈی اسکالر، دی ویمن یونیورسٹی ملتان
ڈاکٹر عذرا پروین
صدرِ شعبہ اردو، دی ویمن یونیورسٹی، ملتان

مجید امجد کی شاعری کا ماحولیاتی تناظر میں مطالعہ

A Study of Majeed Amjad's Poetry in an Environmental Context

Abstract: Majeed Amjad is considered one of the prominent poets of the twentieth century who, through the power of perception, unveiled the mysteries of the universe. Due to his deep connection with the phenomena of nature, he constantly strives to overcome destructive forces. His ultimate goal is to ensure the protection of nature. In his poems, the local environment and its elements are presented in a dynamic manner, and he expresses his emotions with a deeply burning heart. Distressed by environmental pollution and societal negligence, he seeks to draw the attention of state institutions. Trees, birds, footpaths, and other natural elements grow and thrive in his poetry. He addresses diverse themes, ranging from societal issues to awakening collective consciousness.

Keywords: Dynamic, Environment, Social Impact, Urdu Poetry, Pakistani literarure.

ہمارے ارد گرد موجود دل کش مناظر کا لامتناہی سلسلہ، سمندر، پہاڑ، کہکشاں اور قدرت کی ودیعت کردہ بے شمار نعمتیں انسان کے لیے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہی انسان کا قدرتی ماحول بھی ہے۔ کائنات جب اپنے ارتقائی منازل طے کر رہی تھی تو اس کا منظر دور حاضر سے مختلف تھا گویا ایک کورا کاغذ۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کاغذ پر بے ربط نقوش ابھرنے لگے۔ جیسے کسی ننھے بچے نے کھیل کے دوران اس پر بے ترتیب لکیریں کھینچ دی ہوں۔ فطرت بھی کچھ اسی طرح کے مسائل سے دوچار ہوتی رہی ہے۔ انسان نے اپنی بقا اور فائدے کو حاصل کرنے کے لیے مظاہر فطرت میں بگاڑ پیدا کر دیا اور کائنات تذبذب کا شکار ہو گی۔ انسان نے ایسے امور سر انجام دیے کہ اللہ کا نائب بننے کی بجائے اس نے خود کو شیطانی کاموں میں لگا لیا۔ پانی میں کچرا اور پلاسٹک کی بوتلیں پھینک کر، پہاڑوں میں راستہ بنا کر، فصلوں میں نقصان دہ ادویات ملا کر ٹائروں کو آگ میں جھونک کر، نیوکلیئر حملے کر کے زمین میں فساد برپا کیا۔ اس صورتحال کے پیش نظر انسانوں پر بھی اپنے ماحول کے اثرات کسی نا کسی صورت ضرور ہوتے رہے ہیں اور ہر فرد نے اپنے اپنے انداز میں ان فطری افتادات کا اظہار ادب کے توسط سے کیا ہے البتہ اس حوالے سے باقاعدہ ماحولیاتی دبستان کا آغاز دوسری جنگ عظیم سے ہوتا ہے۔ اس عالمی جنگ میں ہونے والی تباہ کاریوں نے جس طرح نسل انسانی کو نقصان پہنچایا جس کا خمیازہ اب تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ عہد جدید میں صنعتی ترقی کے ماحول پر منفی اثرات قدرتی وسائل کی بربادی کا سبب بن رہے ہیں۔ فیکٹریوں سے نکلنے والا دھواں ، سلفر ڈائی آکسائیڈ اور شہروں میں بڑھتی ہوئی سموگ سانس کی بیماریوں میں اضافہ کر رہی ہے۔ جس کے باعث شرح اموات بھی تیز ہو رہی ہے

اگر اس سلسلے میں جلد اقدامات نہ کیے گئے تو بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ عوام کا اس سلسلے میں باشعور ہونا ضروری ہے۔ شجر کاری کی مہمات اور افراد کے تعاون سے ماحول دوست منصوبے تشکیل دیے جاسکتے ہیں:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احسّاس مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات (۱)

کائنات میں بے شمار موجودات زندگی گزار رہی ہیں۔ تخلیق کرنے سے پہلے ہی اللہ رب العزت نے ان کے لیے تمام بنیادی سہولیات اندازے کے مطابق کرہ ارض میں پھیلا دی تھی۔ چند صدیوں پہلے تک انسانی مسکن زمین کا ماحول بھی خاصا خوشگوار تھا۔ اکیسویں صدی میں اس کا ماحول شدید تناؤ کا شکار رہا ہے۔ برق رفتاری سے بدلتا ہوا موسم، مابعد جدید عہد میں صنعتی ترقی اور جدید ٹیکنالوجی نے جس طرح معاشرے کو متاثر کیا وہ آج ہمارے سامنے کی بات ہے۔ اسی وجہ سے آج ہم شاعری میں ماحولیاتی تنقید کو اہم موضوع گردانتے ہیں۔ اردو شاعری میں آغاز سے ہی فطرت نگاری کا رجحان خاصا اہم رہا ہے، قدیم شعراء کے ہاں قدرتی مناظر کی بے شمار جھلکیاں افشاں ہوتی رہی ہیں لیکن باقاعدہ شدت کے ساتھ اس روایت کو نظم کے قالب میں ڈھالنے والی ہستی نظیر اکبر آبادی کی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں فطرت کی تابناکی، دلنشین جمالیات جیسے برسات، سبزہ، مٹی کی سوگند کو دل پذیر انداز میں پیش کیا۔ اسی طرح انجمن پنجاب کی نظموں نے بھی نیچرل شاعری کے رجحان کو تیز کیا۔ رسالہ مخزن نے بھی اسی سلسلے کو مزید پختہ کیا۔ اقبال نے اپنی شاعری میں فطری مناظر کی جولانیوں میں اضافہ کیا اور اپنی نظم ہمالہ میں کوہسار کی بلندیوں کی طرف مراجعت کی۔ خوشی محمد ناظر کی شاعری بھی فطرت کو شعری پیکر میں ڈھالتی ہے۔ بیسویں صدی میں مجید امجد نے نظم کا ایک نیا رخ متعین کیا۔ انھوں نے شاعری میں فطرت کی منظر کشی کرنے کی بجائے ایک تجربے کے طور پر پیش کیا۔ ان کی شاعری میں سرسبز پیڑوں کے سائے نا صرف ہمیں لطف اندوز کرتے ہیں بلکہ انسان اور مشینوں کے بیچ آئی خلیج کی بھی وضاحت کرتے ہیں۔ درختوں کی چھاؤں میں بیٹھنے والا انسان آج اے سی کی ٹھنڈی ہوا میں بیٹھ تو جاتا ہے لیکن اس سبب سے ہونے والے مضمرات ماحول کی تباہی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اپنی ایک نظم "ریلوے سٹیشن پر" میں ریل گاڑی کے پہیوں کی زد میں آنے والے برگ عقیق کے مسلے جانے کا منظر پیش کرتے ہوئے وہ ترقی پر سوال اٹھاتے نظر آتے ہیں:

آج بھی اس دہکتی پٹڑی پر
گھومتے گھنگھناتے پہیوں کو
سیٹیوں کی دھواں اگلتی صدا
جب پیام رحیل دیتی ہے
روز سو سنگتیں اُجڑتی ہیں
لاکھ سنجوگ مسکراتے ہیں (۲)

ماحولیاتی تنقیدی دبستان فرد کا تعلق ارض کے ساتھ جوڑتا ہے بالکل اسی طرح جیسے تانیثی تنقید میں ہم عورت کے حقوق سے متعلق معاشرے میں آگاہی پیدا کرتے ہیں اسی طرح ماحولیاتی تنقید ماحول پر انسان کی من مانیوں سے پیدا ہوئے والا اندیشہ زوال روکنے کی سعی کرتی ہے۔ ماحولیاتی تنقید ادب میں ماحولیاتی منہاج کی کار فرمائی ہے جس کے توسط سے ہم ماحولیاتی استحصال پر مزاحمت کر کے ایک باشعور معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں جہاں ہر فرد ماحولیاتی ذخائر کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی زمینی جڑت کا گہرا ثبوت دے سکتا ہے۔ ماحولیاتی ناقدین کسی فن پارے پر ماحول کے اثرات کا عمیق جائزہ لیتے ہیں:

> "ENVIRO" بشر مرکزیت اور ملحویت کی حامل اصطلاح ہے جو اس تصور پر دلالت کرتی ہے کہ ہم انسان ہی دنیا کا مرکز ہیں جو ان تمام اشیاء (ماحول) میں گھرے ہوئے ہیں جو انسان نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جب کہ اس کے مقابل ECO ایک دوسرے پر انحصار کرنے والے معاشروں، ایک دوسرے میں مدغم ہونے والے نظاموں اور ان کے تشکیلی حصوں کے مابین مضبوط رابطوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ بلاشبہ اس اصطلاح کا استعمال ہی طے کر سکتا ہے کہ کون سی اصطلاح بہتر ہے لیکن کتنا آسان ہوتا اگر ہم اپنے کمپیوٹر پر بیٹھتے اور اپنے موضوع کے لیے ایک واحد اصطلاح ڈھونڈ سکتے۔ (۳)

مجید امجد کا شمار عصر حاضر کہ ان حسّاس شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے بَن نگاری پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ ان کے ابتدائی دور کی شاعری روایتی اور بے اعتنائی شاعری تھی لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے خوشہ چیں رویے کی بدولت جدیدیت سے مملو اپنی ایک الگ پہچان بنالی۔ انھوں نے نا صرف ماحولیاتی مباحث کو مکمل وضع و قطع کے ساتھ قارئین کے سامنے لا کر زندگی کے متنوع پہلوؤں کو اجاگر کیا بلکہ وہ اپنے گرد و پیش میں موجود تمام مناظر کو روانی کے ساتھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں جسے وہ منظر ہماری آنکھوں سامنے وقوع پذیر ہو رہا ہو۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "کنواں" ان کے عمیق مشاہدے کا منہ بولتا ثبوت ہے:

رواں ہے رواں ہے
تپاں ہے تپاں ہے
یہ چکر یونہی جاوداں چل رہا ہے
کنواں چل رہا ہے (۴)

مجید امجد کے کلام کی یہ خاصیت ہے کہ وہ سماج میں ہونے والے مناظر کی اس طرح تصویر کشی کرتے ہیں کہ نہ تو وہ کسی نظریے کا پرچار کر رہے ہوتے ہیں اور نا وہ کسی تحریک یا پراپوگنڈے میں شامل ہوتے ہیں بلکہ وہ معاشرے کے خنجر بکف افراد کی سفاکیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری کے دل پر گہری کسک چھوڑ جاتے ہیں:

"مجید امجد ہمیں کسی آشوب میں چھوڑ کر خود سے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ اُن چند نظموں کو چھوڑ کر جہاں جذباتیت کی سطح زیادہ نمایاں ہے کوئی چیختا چنگھاڑ تا حل پیش نہیں کرتے لیکن اُن کے اُٹھائے ہوئے سوال کی کسک اتنی گہری ہوتی ہے کہ ظالمانہ سماجی ڈھانچے ہلتے ہوئے نظر آتے ہیں"(۵)

مجید امجد اپنی نظم "توسیعِ شہر" میں اپنے ماحول سے گہری عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس نظم میں فطرت کوئی ساکن چیز نہیں بلکہ متحرک کردار بن کر جلوہ گر ہوتی ہے۔ درختوں کے کٹنے کا منظر صرف سرسبز اور سایہ فگن درختوں کے زوال کی کہانی ہی نہیں بیان کرتا بلکہ سرعت کے ساتھ فروغ پاتے بے روح نظام کی بھی ترجمانی کرتا ہے جو جمالیاتی اقدار سے یکسر محروم ہے مجید امجد کی یہ نظم جدید شہری زندگی کے بڑھنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کو بیان کرتی ہے جو فطرت کو مسمار کرنے پر بضد ہے۔۔بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح درختوں کو کاٹ کر کالونیاں تعمیر کی جارہی ہیں۔ آج بے شمار ایسے آلات مارکیٹ میں دستیاب ہیں جو پلک جھپکنے پر درختوں کو گرا دیتے ہیں ۔فطرت سے محبت کے دعویدار تو بے شمار شعرا رہے ہیں لیکن پہلی مرتبہ محبِ فطرت کے طور پر مجید امجد ہمارے سامنے آتے ہیں۔انھوں نے درختوں کا درد محسوس کیا اور بڑے پیمانے پر ان کے خاتمے سے ہونے والے منفی اثرات پر توجہ دی۔ اس نظم کے ذریعے مجید امجد نے انسانیت کو جھنجوڑنے کی سعی کی ہے:

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر بانکے پہرے دار
گھنے سہانے چھاؤں چھڑکتے بور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار (۶)

مجید امجد نے اپنی شاعری میں ماحولیاتی مناظر کو نہایت باریک بینی سے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے ماحول کو محض سطحی نظر سے نہیں پرکھا بلکہ اپنے قوت مشاہدہ کو بروئے کار لاتے ہوئے مظاہر فطرت میں موجود پوشیدہ پہلوؤں پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ مثال کے طور پر نظم "بن کی چڑیا" میں وہ محض ایک چڑیا کی طرف اشارہ نہیں کرتے بلکہ وہ اسے فطرت کے ایک اہم رکن کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جو اپنی دلاویز آواز میں انسان کی بے حسّی کے نغمے گا رہی ہے۔ اس نظم کے ذریعے انھوں نے فطرت اور انسانی زندگی کے گہرے ربط کا اظہار کیا ہے۔ ان کا تخلیقی کینوس

جنگل، سرکنڈوں، وادیوں اور دریاؤں کے ذریعے تنہائی کا احسّاس دلاتا ہے اور ہرن و چڑیا جیسے فطری مناظر انسانی بے توجہی کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ شاعری محض خیالی نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی اور اس کے ماحول کی تصویر کشی کرتی ہے:

کون سنے ہاں کون سنے راگ اس کے راگ البیلے
سب کے سب بہرے ہیں۔۔ میداں، وادی، دریا، ٹیلے
ظالم تنہائی کا جادو ویرانوں پر کھیلے!
دور سرابوں کی جھلمل روحوں پر آگ انڈیلے (۷)

مجید امجد کے ہاں ماحول کی مناسبت سے مقامی علامتیں پائی جاتی ہیں جو قاری کو حظ میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ شاعر مشاطگی سے کام لیتے ہوئے درخت، پگڈیوں، کنواں اور بور لدے چھتنار کا تذکرہ کرتا ہے جو پڑھنے والے کو ذہنی قربت کا احسّاس دلاتے ہیں۔ پیڑ مجید امجد کی شاعری میں متواتر دیکھائی دیتے ہیں جو ان کی فطری وابستگی کا اظہار ہے۔ ان کی نظموں کی بساط تفکر ہے۔ وہ جانتے ہیں کے یہ اشجار ہر فرد کے لیے ہمیشہ سایہ فگن رہتے ہیں:

"مجید امجد کی فکری اور فنی توانائی اس کے موجود ماحول سے جڑی ہوئی ہے اس فطری ربط نے مجید امجد کو ماحول، اور عناصر فطرت کا لافانی شاعر بنادیا ہے۔ جو اپنے ماحول اور مقامیت کی بات کرتا ہے۔ اس کی نظموں کا منظر نامہ کچے گھروں پر مشتمل بستیوں، باغات، شہری زندگی کی گہما گہمیوں اور بدلتے ہوئے موسموں کے تغیرات سے بھرا ہوا ہے"(۸)

مجید امجد کی شاعری میں تہذیبی و تمدنی شعور کا عمل دخل وادی سندھ (ہڑپہ) اور پنجاب کے نظام آب پاشی سے آتا ہے۔ وہ اس زرعی سماج میں رہتے ہوئے فطرت اور انسانی رشتوں کا غائر نگاہ سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ کھیت، فصلیں، ندی نالے جیسی جزئیات کا استعمال کرتے ہوئے اپنے ماحول کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے معاشرے کے ظالم و جابر طبقے سے بھی نقاب اٹھاتے ہیں۔ نظم "ہڑپے کا ایک کتبہ" میں وہ مظلوم کسانوں، قاہر و غاصب جاگیر داروں اور تقدیر کے مارے انسانوں کی کرب ناک صورتحال کو اجاگر کرتے ہیں۔ وہ دریائے راوی کے کنارے دلکش مناظر فطرت کی تصویر کشی کرتے ہیں جہاں ایک کسان بیلوں کی جوڑی کے ساتھ ہل چلا رہا ہے، شاعر متمنی ہے کہ قاری تدبر کرے کہ وہاں دو بیل نہیں بلکہ تین ہیں۔ یہ نظم تین ہزار سال پہلے سے لے کر اب تک دہقاں پر ہونے والے مظالم کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کھیت کی تقدیر تو بدلنے کی قدرت رکھتا ہے مگر اپنی قسمت کے ہاتھوں ناچار ہے:

کون مٹائے اُس کے ماتھے سے یہ دُکھوں کی ریکھ
ہل کو کھینچنے والے جنوروں جیسے اُس کے لیکھ

تپتی دھوپ میں تین بیل ہیں، تین بیل ہیں، دیکھ (۹)

انسان نے قدرتی ذخائر کا استعمال اپنے مفاد کو حاصل کرنے کے لیے کیا تو کرہ ارض کو بے شمار خطرات کا سامنا کرنا پڑا گلوبل وارمنگ، گرین ہاؤس گیسز اور زمین کے بڑھتے درجہ حرارت نے زمین کو ابتر صورتحال میں مبتلا کر دیا۔ انسانی بے حسّی نے معاشرے کو اس نہج پر پہنچا دیا کہ آنے والی پیڑی کو زندہ رہنے کے حفاظتی اقدامات کرنے پڑیں گے جسے درختوں کا فروغ، ڈیموں کی تعمیر وغیرہ۔ ایسے میں مجید امجد ماحولیاتی اور تہذیبی شعور کے آئنہ دار بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ نظم "پنواڑی" بھی ماحولیاتی عناصر کا شاہکار ہے۔ جس کے ذریعے مجید امجد نے معاشرے کی تلخ حقیت کو دکھانے کی سعی کی ہے۔ وہ زندگی کے تسلسل اور خوابوں کی منتقلی کو نسل در نسل جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ بوڑھا پنواڑی اپنی ساری زندگی محرومیوں میں گزار دیتا ہے۔ وہ بوسیدہ دکان میں سگریٹ کی خالی ڈبیایوں کے محل بنا کر زندگی گزارتا ہے اس کی ارتھی اٹھ جانے کے بعد اس کا فرزند اس کی دکان سنبھال لیتا ہے۔ فانی دنیا کی حقیقت بھی اس نظم کے ذریعے قارئین کے سامنے آجاتی ہے۔ موت ایک فطری عمل ہے۔ بے شمار شعرا نے اپنی شاعری میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن مجید امجد اس تصور فنا کو نہ صرف انسانی زندگی سے جوڑتے ہیں بلکہ ماحول پر اس کے اثرات کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں مثلاً درختوں کے کٹنے سے زمین کی روح کا زخمی ہو جانا، دریا خشک ہونے سے زندگی کا دم توڑ جانا وغیرہ۔ موت مجید امجد کی شاعری کا کوئی فلسفیانہ موضوع نہیں ہے بلکہ کائنات کی ایک سچائی ہے جہاں بے حسّی کے ساتھ ساتھ وسائل فطرت کا بے دریغ استعمال بھی خارجی جبر کے طور پر پیش کیا گیا ہے:

عمر اس بوڑھے پنواڑی کی پان لگاتے گزری
چونا گھولتے ، چھالیا کاٹتے ، کتھ پگھلاتے گزری
سگریٹ کی خالی ڈبیوں کے محل سجاتے گزری
کتنے شرابی مشتریوں سے نین ملاتے گزری
چند کسیلی پتوں کی گتھی سلجھاتے گزری (۱۰)

مجید امجد قلم کاری کرتے وقت اپنے ماحول میں موجود اشیاء کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ وہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے تدریجی نوعیت اختیار کرتے ہیں۔ ان کے تخلیقی سفر میں تغیر و تبدل ایک جھٹکے میں نہیں طے ہو جاتا بلکہ رفتہ رفتہ لہجہ اور اسلوب اظہار نکھرتا ہے۔ اسی تدریجی جدوجہد کی ایک کڑی پیکر تراشی بھی ہے۔ شعرا متقدمین کے ہاں پیکر تراشی تکنیک کے طور پر استعمال نہیں ہوئی بلکہ اسے محض شاعری میں آرائش و زیبائش کے لیے ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ مجید امجد کی ابتدائی شاعری میں پیکر تراشی تشبیہات کا رنگ لیے ہوئے ہے جو کم ندرت اور تنوع کے ساتھ ساتھ منظر نگاری تک محدود نظر آتی ہے۔ بعد ازاں وہ کھیتوں، پرندوں اور ہوا کے جھونکوں کو اس ترتیب سے پیش کرتے ہیں کہ بظاہر عام فہم نظر آنے والی اشیاء میں بھی معنویت جھلکنے لگتی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی جزئیات کی مدد سے اشیاء کے تصویری پیرائے بنانے لگتے ہیں۔ بقول سید عامر سہیل:

"مجید امجد کے یہاں پیکر تراشی کا مطالعہ ایک خاص ترتیب کا متقاضی ہے۔ ان کے یہاں دو انداز کے رویے نمایاں ملیں گے۔ پہلا تو شعوری پیکروں کا ہے، جو اپنی تمام تر کیفیات میں حسی ادراک اور ماحول کی عکاسی کرتے ہیں جب کہ دوسرا انداز ماورائے واقعیت پیکروں یا ریلسٹ امیجز کا ہے اسے اگر خوابیدہ پیکر یا ڈریم امیج بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔"(۱۱)

مجید امجد کا شمار ان چند معدودے شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی نظموں میں تہ دار معنویت کی بدولت بیسویں صدی کے اہم شعراء میں اپنا ایک منفرد مقام بنالیا۔ ماحولیاتی عناصر کا بیان امجد کی شاعری میں نا صرف مقامی فکر میں گندھے ہوئے اسلوب پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے بلکہ بلاغت بھی پیدا کرتا ہے- مشرقی اقدار، ثقافت اور زمینی حقائق سے مزیّن ان کی شاعری ماحولیاتی تنقید کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ وہ فطری مظاہر کے استحصال پر پُر اثر احتجاج کرتے ہیں اور بشر کی جسمانی و انسانی ضروریات پوری کرنے کے لیے فطرت کے اندھا دھند اکارت کیے جانے کی روش پر سخت مذمت کرتے ہیں۔ فطرت کے معاملے میں ان کا اس حد تک حسّاس ہونا کہ دیگر موجودات کو بھی بشریت کا درجہ دے دینا ،یعنی انسانی جذبات و احساسات خوشی، غم، پیار محبت جیسے عناصر جس طرح انسانوں کو متاثر کرتے ہیں اسی طرح فطرت کو بھی متاثر کرتے ہیں سچ میں قابل ستائش ہے۔ بقول ڈاکٹر ناصر عباس نیّر:

"مجید امجد اپنی نظموں میں جس دنیا کی تصویر کھینچتے ہیں وہ صرف انسان اور اس کی آرزوؤں کا جہان نہیں۔ درخت، فصلیں، پرندے، جانور اس دنیا کا حصہ ہی نہیں بلکہ برابر کے حقوق رکھنے والے باشندے ہیں۔ اس ضمن میں مجید امجد کا رویہ خاصی حد تک قدیم اساطیری انسان کا ہے۔ اساطیری انسان ہر شے کو نہ صرف اپنی ہی طرح زندہ محسوس کرتا تھا، بلکہ اپنی دنیا میں ان کے وجود کو نہایت معنی خیز بھی سمجھتا تھا؛ درخت، جانور، پرندے اس کے خاندان کے افراد کی مانند ہوا کرتے ہیں۔"(۱۲)

مجید امجد کسی ایک دور کے واقعات اور ان میں ہونے والے سانحات کی ترجمانی تک محدود نہیں رہتے بلکہ وہ پوری کائنات میں فروغ پانے والے دکھ کے نباض بن کر کل جہان کا نوحہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری درد مندی کے انمول جذبے سے سرشار ہے پھر وہ درد چاہے درختوں کے کٹ جانے کا ہو یا پرندوں کو بندوق کا ہدف بنانے کا۔ وہ اپنی شاعری میں دکھیاروں اور غم کے ماروں کے لیے خاص گوشہ رکھتے ہیں۔ بچوں، قیدیوں اور بے گھر لوگوں کے لیے بھی ان کی حسّاس طبعیت مثبت جذبات رکھتی ہے۔ "ایکسیڈنٹ" نظم امجد کی اسی درد مندی کا نتیجہ ہے جو قاری کے دل پر کٹاری چلا کر جھنجوڑنے کی سعی ہے۔ اس نظم سے ہمیں یہ تاثر ملتا ہے کہ ایک ترقی یافتہ شہر میں کس طرح ایک معصوم جان کے چلے جانے پر کسی کو کوئی ملال نہیں ہے۔ ننھی جانیں آئے روز اس معاشرتی نظام کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ شاعر اس نظم کے ذریعے اجتماعی ضمیر کو بیدار کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اس حادثے کی روداد اسی بچے کی زبانی سناتے ہیں جو ایک بے ضرر سی خواہش کی تکمیل میں ایک رنگ برنگی گیند کو پانے کے لیے

دوڑتا ہے اور اپنی جان گنوا دیتا ہے۔ اس بچے کا یہ کہنا "ابھی تو میرا روغن بھی کچا تھا" قارئین کے دل موم کی طرح پگھلا دیتا ہے۔ نظم میں شاعر نے براہ راست کسی پر کوئی الزام نہیں لگایا البتہ سنگدل معاشرے کی بے حسّی پر اسی بچے سے سوال کرواتے ہیں "اس مٹی پر مجھ کو انڈیل دیا یوں کس نے"۔ یہ مختصر مگر فکری گہرائی سے لبریز نظم مجید امجد کے سماجی شعور کی عکاسی کرتی ہے:

مجھ سے روز یہی کہتا ہے، پکی سڑک پر مسلا ہوا وہ داغ لہو کا
میں نے تو پہلی بار اس دن
اپنی رنگ برنگی قاشوں والی گیند کے پیچھے
یونہی ذرا اک جست بھری تھی
ابھی تو میرا روغن بھی کچا تھا
اس مٹی پر مجھ کو انڈیل دیا یوں کس نے
اوں اوں۔۔۔۔ میں نہیں مٹتا، میں تو ہوں، اب بھی ہوں (۱۳)

مجید امجد اپنی نظم "ہیولی" میں پیچیدہ تخلیقی لمس کی کیفیات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ ماحول میں موجود کرداروں اور ان کے وقوع پذیر ہونے والے سانحات کا احاطہ کرتے ہیں۔ انھوں نے برف باری کے منظر سے ایسا فسوں خیز ماحول تشکیل دیا کہ قاری ایک نادیدہ نگری میں پہنچ کر نئے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہے جہاں وہ ایک حسینہ کی یاد میں کھو جاتا ہے۔ بالآخر شاعر کے اندر جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اسے خوابوں سے انقطاع کر کے واپس اپنی دنیا میں لے آتا ہے۔ وہ خود کو ماحولیاتی فکروں میں منہمک کر کے تجسس آمیز اسلوب تشکیل دیتے ہیں۔ نظم کی تخیلاتی فضا اور پے در پے رونما ہونے والے واقعات اس نظم کو مزید مستحکم کر دیتے ہیں:

لے تھمی اور نغمہ گر کا پیکر بے جاں گرا
سیڑھیوں سے آسماں کی ٹوٹتی محراب تک
بکھرے پھولوں کی چٹختی پنکھڑیوں پر تیز قدموں کی دھمک
آہٹوں کے اس بھنور میں اک جھجکتی چاپ کی دھیمی جھنک
میرے دل کی دھڑکنوں کو روندنے والی کسک (۱۴)

جدید اردو نظم کی آبیاری میں مجید امجد کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی ذاتی زندگی تنہائی کے حصار میں دکھائی رہتی ہے جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ دنیا سے منقطع ہو کر محض شاعری کو اپنا کل سرمایہ سمجھتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے انھوں نے ماحول میں موجود خفیف سے خفیف شے کو بھی اپنی گرفت سے جانے نا دیا۔ وہ ہر سماجی مسئلے کو فکری آگہی کی بھٹی میں سلگاتے ہیں اور پھر ایک گہرا قلبی کرب ان کی نظموں میں ابھرتا ہے۔ طبقاتی کشمکش کا اُودھم اسی وجہ سے ان کی شاعری میں ظہور پذیر نہیں ہوتا بلکہ اس کا دھیما احسّاس آشکار ہوتا ہے جو ان کی باریک بین اور

معاملہ فہم نظر کا نتیجہ ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کربناک صورت حال نے مجید امجد پر نہ تو "سناٹا مسلط کیا" اور نہ اسے چیخ اٹھنے پر اکسایا ۔ دوسری طرف اس احسّاس نے تو جیسے اس کے اندر خود آگہی کو جنم دے ڈالا۔ مجید امجد کے الفاظ میں:

"لیکن اس اک بے بہا غفلت کو اپنانا بھی تو کتنا کٹھن ہے
پھر دیواریں میرے گرد اٹھ آئی ہیں۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔۔۔
پھر خود آگہی کا دھندلا سا مقدس دیا مری ہستی کی قبر پر ٹمٹمانے لگا"(۱۵)

"پھولوں کی پلٹن" میں مجید امجد نے ماحول کی عقدہ کشائی استغراق سے کی ہے۔ اس نظم کے ذریعے وہ طبقاتی نظام کی طرف بھی قارئین کی توجہ مرکوز کرواتے ہیں اور ماضی کے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شدید سردی میں ٹوٹے پھوٹے فرشوں کی بد حالی، غربت اور سکول جاتے بالکوں کی ابتر حالت، معاشرے میں طبقاتی صورتحال کا شاخسانہ پیش کرتے ہیں اور اسی اثنا میں اشرافیہ کا اوور کوٹ میں ملبوس ہونا اور ٹھٹھرتی سردی میں سیر و تفریح سے لطف اندوز ہونا معاشرے کے غیر مساوی رویے اور طبقاطی تفریق کی نمائندگی کرتا ہے۔ نظم اپنے آخری مراحل میں تقدیر کی بدلتی کروٹ دیکھاتی ہے کہ کس طرح اب غربت ختم ہوگئی ہے اور ہمارے بچے نتھری ہوئی وردیاں پہنے پھولوں کی پلٹن کی مانند دکھائی دے رہے ہیں۔ شاعر آنے والی نسلوں سے ہم کلام ہوتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم نے جو خواب اپنے لیے دیکھے تھے ان کی تعبیر تمہاری کامیابی و کامرانی کی صورت ہمارے سامنے ہے۔ یہ ہمارے خوش آئند مستقبل کی علامت ہے۔ اس نظم میں سرد موسم، گلیوں کی خستگی، ٹھنڈی ہوا اور اکھڑے فرش کے ذریعے انسانی معاشرے کو یہ پیغام دیا گیا ہے کہ موسم اور جدید سہولیات کا اثر معاشرتی طبقات پر بھی ہوتا ہے۔ بہترین معاشرہ وہی ہوتا ہے جو متوازن ہو اور تمام انسانوں کے حقوق کے موافق ہو:

ہم سب بھرے بھرے جزدان سنبھالے
لوحیں ہاتھوں میں لٹکائے
بنا بٹن کے گریبانوں کے پلو ادھڑے کاجوں میں اٹکائے
تیز ہواؤں کی ٹھنڈک اپنی آنکھوں میں بھر کر
چلتے چلتے تن کے کہتے:
"نہیں تو، کیسی سردی۔
ہم کو تو نہیں لگتی۔۔۔۔"(۱۶)

مجید امجد اپنی نظم امروز میں عمیق خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ زندگی کی ناپائیداری کا بیان کرتے ہیں کہ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے ایک دن اگر اجالا تو اگلے ہی پل اندھیرا ہو جاتا ہے۔ ایک کمزور لمحہ میری زندگی کو پلٹ کر تہ آب لے جائے گا۔ اس فانی دنیا میں میری زندگی کی معیاد قلیل ہے ۔ شاعر وقت کے تصور سے فکر مند ہے کہ اس نے نا جانے کتنی ہی عظیم شخصیات کا نام اپنی رتھ کے پہیوں تلے روند کر عالم رنگ و بو سے مٹا دیا۔ ہر

شخص اس ظالم وقت کے ہاتھوں خود کو بے بس محسوس کرتا۔ ناجانے کتنے لوگوں کی امیدیں، خواب اور زندگیاں وقت کے بے رحم تھپیڑوں کا نشانہ بن چکی ہیں۔ آدمی زندگی کی دوڑ میں اپنی پہچان بھی بھول جاتا ہے ماضی اور مستقبل کو سوچنے کی تو مہلت ہی نہیں ملتی۔ یہ لمحہ موجود ہی ہے جو شاعر کی کل کائنات ہے جس میں وہ کوشش، تخلیق اور فریاد کر سکتا ہے۔ شاعر کو احسّاس ہے کہ آج کی صبح قدرت نے مجھے ودیعت کی ہے تاکہ شادمانی سے آج کا خوبصورت دن گزار سکے۔ دن نکلتے ہی چڑیا جب دلفریب گیت سناتی ہے آنگن میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور پڑوس میں بہتا کنواں خود شاعر کو فطرت کی موجودگی کا احسّاس دلاتے ہیں۔ اس نظم میں موجود قدرتی مناظر مثلاً صبح، سمندر، اندھیرے، رتھ وغیرہ ماحول کو پُراثر بنا کر ایک دلکش فضا وپیدا کر دیتے ہیں۔ قدرت کے ان دلکش مناظر کی خاموش گفتگو شاعر اپنی چشم بصیرت سے محسوس کرتا ہے۔

یہ صبائے امروز جو صبح کی شاہزادی کی مست انگھڑیوں سے ٹپک کر
بدور حیات آگئی ہے یہ ننھی سی چڑیاں جو چھت میں چہکنے لگی ہیں
ہوا کا یہ جھونکا جو میرے دریچے میں تلسی کی ٹہنی کو لرزا گیا ہے
پڑوسن کے آنگن میں پانی کے نلکے پہ یہ چوڑیاں جو چھنکنے لگی ہیں
یہ دنیائے امروز میری ہے، میرے دل زار کی دھڑکنوں کی امیں ہے
یہ اشکوں سے شاداب دوچار صبحیں، یہ آہوں سے معمور دوچار شامیں!
انہی چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے وہ جو کچھ کہ نظروں کی زد میں نہیں ہے (۱۷)

مجید امجد کی شاعری میں مقامیت کا تصور محض دیہاتی ثقافت کی ترجمانی ہی نہیں کرتا بلکہ ماحول کا مکمل ادراک بھی ان کی شعری معنویت کا بنیادی مظہر ہے۔ یہاں تک کہ "کیکر کے پیڑوں کی لمبی قطاریں" اور "نہروں میں بہتا ہوا مست پانی" ان کی فطرت سے وابستگی اور ماحول میں موجود اشیاء کی حرکات وسکنات پر نظر غایت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ انسان اور فطرت کو الگ نہیں سمجھتے۔ گوبر، کھیت، آم، نہریں یہ سب عناصر انسانی بقا کے لیے ضروری ہیں انسان فطرت سے کٹ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ فطرت اور انسان کے درمیان ہم آہنگی ان کی شاعری کو مزید تقویت کی راہ پر گامزن کرتی ہے:

"کہا جاسکتا ہے کہ ان کی مقامیت محدود ہے لیکن مجید امجد اس سے زندگی کے وسیع معانی اخذ کرتے ہیں۔ ان کی مقامیت مقامی فطرتی مناظر و مظاہر اور ثقافت و معاشرت سے تشکیل پاتی ہے۔ ان کے ہاں گادی، اَنی، لائی، سونٹی، ہالی، پالی، گوبر، چھکڑا، ڈوڈے، ابھاگن اور درانتی جیسے ثقافتی الفاظ اور بھیڑ، بکری، بھینس، گائے، بیل، کھلواڑا، اور بیساکھ، بانسری، آم، کیکر اور سرکنڈے جیسے مقامی، ثقافتی و فطرتی مظاہر تخلیقی تجربے سے ہم آمیز ہو کر شعری تجربے میں رچ بس جاتے ہیں" (۱۸)

المختصر یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں ارفع مقام رکھتا ہے تو اسے اپنے ہر فعل میں اپنے بلند مرتبے کا پاس رکھنا چاہیے دیگر موجودات کے مقابلے میں اسے زیادہ باشعور اور فطری قوانین کا محافظ ہونا چاہیے۔ اگر انسان اپنے ارد گرد اور اپنے باطن کی آلودگی کی تطہیر کر لے تو وہ ایک ایسا معاشرہ تخلیق دے سکتا ہے جو ماحول دوست ہو اور مضر آلائشوں سے پاک ہو۔ مجید امجد نے بھی اپنے ماحول میں جو دیکھا اور محسوس کیا اسے اخلاقی سبق کے ساتھ قارئین کے گوش گزار کیا۔ وہ جب بھی کوئی نظم لکھتے فطرت سے ہوتے ہوئے ان کا تعلق سیدھا معاشرے سے جا کر جڑ جاتا تھا۔ ان کی نظموں میں فطری اجزاء کی نمو پذیری قاری کے انجذاب نظم کا سبب بنتی ہے۔ قارئین محض مرقوم نظم کے الفاظ عجلت سے ادا نہیں کرتے بلکہ ان کی قرات نظم کو مجسم کر دیتی ہے۔ ایک ایسا دل کو لبھانے والا بصری وجود تخلیق پاتا ہے جس کا درد نا صرف وہ خود محسوس کرتے ہیں بلکہ قاری کے دل پر بھی نقش مرتسم کر دیتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. علامہ اقبال۔ بال جبریل۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۵ء طبع بستم۔ ص ۱۰۸

۲. مجید امجد۔ کلیات مجید امجد۔ (مرتبہ) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔ نئی دہلی: فرید بک ڈپو، ۲۰۱۱ء۔ ص ۳۳۳

۳. ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی۔ ماحولیاتی تنقید: نظریہ و عمل۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء۔ ص ۱۸

۴. مجید امجد۔ کلیات مجید امجد۔ (مرتبہ) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔ ص ۶۰

۵. ڈاکٹر سہیل احمد۔ مجید امجد کی نظم نگاری کی محسوساتی اور فکری جہتیں۔ "مشمولہ "مجید امجد شناسی بحوالہ مجلہ اوراق۔ (مرتبہ) ڈاکٹر سید عامر سہیل۔ فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۵ء۔ ص ۱۲۴

۶. مجید امجد۔ کلیات مجید امجد۔ (مرتبہ) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔ ص ۳۵۲

۷. ایضاً۔ ص ۹۳

۸. ڈاکٹر اشرف جاوید ملک۔ پاکستانی اردو نظم ماحولیاتی تناظر۔ ملتان: بکس اینڈ ریڈرز، ۲۰۲۴ء۔ ص ۱۵۷

۹. مجید امجد۔ کلیات مجید امجد۔ (مرتبہ) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔ ص ۳۳۶

۱۰. ایضاً۔ ص ۸۸

۱۱. ڈاکٹر سید عامر سہیل۔ مجید امجد نقش گر ناتمام۔ لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۸ء۔ ص ۳۴۳

۱۲. ڈاکٹر ناصر عباس نیر۔ مجید امجد حیات، شعریات اور جمالیات۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔ ص ۱۵۰

۱۳. مجید امجد۔ کلیات مجید امجد۔ (مرتبہ) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔ ص ۴۶۹

۱۴. ایضاً۔ ص ۳۶۵

۱۵. ڈاکٹر وزیر آغا۔ مجید امجد: ایک دل درد مند ، (مضمون) مشمولہ مجید امجد نئے تناظر میں ، احتشام علی (مرتبہ)۔لاہور ،: بیکن بکس ، ۲۰۱۴ء۔ ص ۵۳

۱۶. مجید امجد۔ کلیات مجید امجد۔ (مرتبہ) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔ ص ۴۹۷، ۴۹۶

۱۷. ایضاً۔ ص ۱۰۱

۱۸. اورنگ زیب نیازی۔ اردو ادب ماحولیاتی تناظر۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۲ء۔ ص ۹۵